۵

مسلم شناخت کی دھوپ چھاؤں

ویلفرڈ کینٹویل اسمتھ نے کوئی چالیس سال پہلے جب اس بات کا دعویٰ کیا تھا کہ وہ اپنی مسیحی مذہبی روایت کی پاسداری کے باوجود ایک سچے پکے مسلمان ہیں تو ان کے اس دعوے پر راسخ العقیدہ مسلم حلقوں میں خاصے حزم واحتیاط اور ذہنی تحفظ کا مظاہرہ کیا گیا۔ اسمتھ کا کہنا تھا کہ اسلام کوئی قومی یا ملی شناخت نہیں بلکہ عبودیت کاملہ کا ایک عملی رویہ ہے، سو جس نے بھی خدا سپردگی اختیار کی، اور اپنے آپ کو خدائے واحد کی غیر مشروط عبودیت میں دے دیا، اس نے اسلامی شناخت اختیار کرلی، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہبی طائفے، ثقافتی گروہ یا جغرافیے سے ہو۔ انہوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں یہاں تک کہا کہ انگریزی میں شاید میرے لئے یہ کہنا ممکن ہو کہ میں مسلمان نہیں ہوں کہ انگریزی زبان میں لفظ مسلم کے معنی ایک ایسی قوم کے ہیں جو متبعینِ مسیح سے مختلف مذہبی شناخت کی حامل ہے البتہ اسی بات کو میں عربی زبان میں اس طرح نہیں کہہ سکتا کہ لست بمسلم کہ عربی زبان میں ایسا کہنا خدا سپردگی سے انکار پر مبنی ہوگا جو مجھ جیسے مذہبی انسان کے لئے ممکن نہیں۔

اسمتھ کے اس دعوے کے سلسلے میں جس ذہنی تحفظ کا اظہار ہوا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شاگرد رشید مشیر الحق، جنہوں نے مختلف مواقع پر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسمتھ کی ان تعبیرات کی بھرپور وکالت کی، انہوں نے بھی ہر موقع پر اس خیال سے دوری بنائے رکھنے میں ہی عافیت جانی۔ یہ سوال بحث طلب رہا کہ سچے متبع یا مسلم حنیف ہونے کی بنیادی شرائط کیا ہیں۔ فی زمانہ اسلام کا دعوے دار صرف قوم مسلم کا فرد ہوسکتا ہے یا اس سے باہر بھی متبع نفوس کا پایا جانا ممکن ہے۔ دیکھا جائے تو اسمتھ کا یہ دعویٰ اور اس سے پیدا ہونے والی بحث اسی قدیم فقہی اور کلامی بحثوں کا ایک جدید پرتو ہے جہاں کبھی یہ سوال

معرضِ بحث رہا تھا کہ مسلمان ہونے کے لئے کون سی بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے، عمل یا عقیدہ؟

یہ سوال کہ مسلمان واقعی کون لوگ ہوسکتے ہیں؟ ہمارے لئے محض کسی پرانی بحث کو زندہ کرنا نہیں بلکہ ایک ایسے بنیادی سوال کا محاکمہ کرنا ہے جس پر قومی مسلمانوں کے تصورحیات کا انحصار ہے۔

ایک فقہی ذہن جب قرآن مجید کے صفحات میں مسلم حنیف کی تعریف کی تلاش کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے کہ یہاں قانونی انداز کی تشریح وتوضیح سے یکسر اجتناب کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سارا زور اس بات پر ہے کہ انسان خدائے واحد کے آگے غیر مشروط سپردگی میں اس قدر محو ہوجائے کہ اسے اپنی ملی قومی شناخت نسلی اور جغرافیائی رشتے صبغۃ اللہ میں گم ہوتے ہوئے معلوم ہوں: ﴿ومن احسن من الله صبغة و نحن له عابدون﴾ (بقرۃ:۱۳۸)۔ قرآن مجید میں جابجا مختلف اسالیب میں اہل ایمان کے طائفوں کو گروہی اور مسلکی شناخت کو ترک کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کونوا ربانیین کی یہ دعوت اہل کتاب کے متحارب گروہوں کو مسلم حنیف بننے کی ترغیب دیتی اور ملت ابراہیم کی پیروی کی طرف بلاتی ہے۔ بعض مقامات پر صراحت کے ساتھ اس بات کا تذکرہ ہے کہ ابراہیم واسمٰعیل، اسحٰق ویعقوب اور اہل حق کے دوسرے خانوادوں کا تعلق نہ تو مروجہ یہودی مذہب سے تھا اور نہ ہی انہوں نے خود کو کبھی یہودی یا نصرانی کہلانا پسند کیا۔ مذہبی شناخت کے اس قضیے کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن نے یہ بات صاف کردی کہ طریقۂ براہیمی کی پیروی کرنے والوں کو خدا نے اطاعت شعاروں کی شناخت سے متصف کیا ہے۔ کونوا ربانیین اور صبغۃ اللہ کے تناظر میں دیکھئے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ خدا جو اقوامِ عالم کا رب ہے اطاعت شعاروں سے ایک ایسے عالمی معاشرے کی تشکیل کا خواہاں ہے جہاں تمام مسلکی، ملی، جغرافیائی، نسلی شناخت پر اطاعت شعاری کا رنگ غالب آجائے۔

مسلمان کی تعریف کے تعین میں ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن مجید میں امت مسلمہ کا تصور اہل ایمان کے مختلف طائفوں پر محیط ہے۔ دعائے براہیمی ﴿ واجعلنا مسلمين لك ومن ذريتنا امة مسلمة لك ﴾ تمام انبیائے سابقین کی باقیات اوران کے سچے متبعین کو امت مسلمہ کا رکن رکین قرار دیتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو ان انبیاء سے نسلی یا ملی تعلق کے باوجود راہِ سپردگی کو ترک کرچکے ہوں تو ان کے لئے خدا کا ارشاد ہے: ﴿لاينال عهدى الظالمين﴾۔ گویا قرآن مجید کے مطابق مسلمان بنے رہنے کے لئے کسی مسلمان یا متبع گروہ سے صرف رسمی تعلق ہی کافی نہیں بلکہ عمل سے اس کی شہادت بھی لازم ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ خدا دعائے براہیمی سے ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیتا جو پیدا تو اہل حق کے طائفے میں ہوئے ہیں البتہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے اب وہ امت مسلمہ کی بشارتوں کے مستحق نہیں رہے۔

قرآن مجید نے مسلمان بنے رہنے کے لئے دین براہیمی کی پیروی، انبیائے سابقین کا اثبات، کتب، ملائکہ اور آخرت پر یقین کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ اہل ایمان تمام انبیائے سابقین کو خانوادۂ نبوت کا رکن مانتے ہیں اور

یہ کہ وہ ان کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں۔ البتہ فقہ کی کتابوں میں مسلم حنیف کی تعریف چونکہ امت مسلمہ کے وسیع پس منظر کے بجائے امت محمدیہ کے تناظر میں متعین کی گئی ہے اس لئے یہاں مسلمان کی قرآنی تعریف پر گروہ مسلمین کی قومی شناخت غالب آگئی ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے مسلم قوم کے اندر پیدا ہونے والا ہر شخص خواہ فکر وعمل میں اسے ملت براہیمی سے کوئی نسبت ہو یا نہ ہو وہ اعلیٰ درجے کا مسلمان قرار پایا۔ جب کہ انبیائے سابقین کے طائفوں میں پائے جانے والے متبع نفوس بھی کافر کی حیثیت سے دیکھے گئے۔ بعد کی صدیوں میں اسلام کی آفاقی شناخت پر مسلم قومی شناخت کچھ اس حد تک غالب آگئی کہ مسلمانوں جیسا رہن سہن رکھنے، ان کے لباس وعادات کو اختیار کرنے اور ان کی معاشرت اور تہذیب کو بروئے کار لانے کو اسلام کا ہم معنی سمجھا جانے لگا۔ ابن تیمیہ کے عہد تک آتے آتے صورتِ حال اتنی خراب ہوگئی کہ عربی زبان اور عرب تہذیب کو اسلام کا اصل الاصل قالب سمجھا جانے لگا۔ فارسی زبان کے بارے میں ابن تیمیہ جیسے متکلمِ اسلام نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فارسی زبان کا سیکھنا لوگوں کو نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ خیال ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا کہ نفاق اور کفر کا تعلق زبان اور تہذیب سے نہیں بلکہ قلب ونظر کے فساد سے ہے اور یہ کہ عہد رسولؐ میں منافقین کی جو کھیپ پائی جاتی تھی وہ سب عرب تہذیب کے ہی قالب سے اٹھے تھے، کسی فارسی یا اجنبی تہذیب کے پیدا کردہ نہیں تھے۔ برصغیر ہند و پاک میں شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ کے یہاں عرب تہذیب پر غیر معمولی اصرار اور اسے اسلام کا اصل الاصل قرار دینے کی کوشش بھی دراصل اسی خلط مبحث کا اظہار ہے جو ایک آفاقی اسلامی شناخت کو مسلمانوں کے قومی شناخت سے متصف کرتی ہے۔

آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں جب امت محمدیہ صدیوں سے خود کو انحطاط میں مبتلا پاتی ہے اور جہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے لئے اٹھنے والی پر جوش تحریکیں ہمیں کسی قومی احیاء سے دوچار کرنے میں بھی ناکام رہی ہیں اس بات کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ہم ان بنیادی سوالوں پر از سرِ نو غور کریں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ فلاح ونجات کی آسمانی دعوت جس کے سبب ہم کبھی اقوامِ عالم کے نجات دہندہ سمجھے جاتے تھے خود ہماری قومی بہبود کا سامان فراہم نہیں کرتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جو آخری پیغام کے امین ہیں انبیائے سابقین کے متبعین کی طرح صبغۃ اللہ کی تلقین کے بجائے لوگوں کو یہودی یا نصرانی بنانے پر مصر ہوں اور یہ کہتے پھرتے ہوں کہ نجات تو بس ہمارے گروہ سے جڑ جانے کا نام ہے۔ بھلا کسی ایسے قومی پروجیکٹ میں غیر اقوام کے لئے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟

عہد رسولؐ میں ہماری کامیابی ایک آفاقی تصورحیات اور بلند نگہی کے سبب تھی۔ محمد رسول اللہ کی دعوت پر لوگ ایک ایسی دنیا کے قیام کے لئے اٹھے تھے جس پر صرف صبغۃ اللہ کی چھاپ ہو۔ یہ لوگ اپنے وقت کے دوسرے لوگوں سے اگر ممتاز اور منفرد ہوگئے تھے تو اس کی وجہ ان کا تصور حیات تھا ورنہ لباس ومعاشرت، زبان اور قبائلی نسبت میں وہ بھی اپنے عہد کے دوسرے لوگوں

کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ البتہ قلب ونظر کی تبدیلی نے انہیں ایک ایسی بلند نگہی اور وسعت قلبی عطا کی تھی کہ وہ اپنے قومی اور ملکی مفاد کے بجائے اقوام عالم کی فلاح ونجات کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ گویا اسلام نے ان کے دلوں کی دنیا بدل ڈالی تھی۔ اب اگر کوئی شخص تبدیلیٔ قلب ونگاہ کے بجائے صرف ان کے عادات واطوار، لباس وتہذیب کو اختیار کرنے پر زور دے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس ظاہری اتباع میں محمد رسول اللہ کے متبعین کی پاسداری کر رہا ہے یا اسی عہد میں ظاہری طور پر کچھ اسی طرح دکھائی دینے والے کفارانِ قریش کی۔ عہد رسول میں محمدؐ رسول اللہ پر ایمان لانا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ شخص مذکور جھوٹی وفاداری اور جھوٹی شناخت سے منہ موڑ کر متبعین کے آفاقی معاشرے کے قیام میں منہمک ہو گیا ہے۔ متبعین محمد کے قدسی کارواں میں شمولیت کے لئے قلب ونظر کی یہ تبدیلی کافی سمجھی جاتی تھی۔ اسے نہ تو مسلمانوں کا سا لباس اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ کلمہ پڑھ کر کوئی نیا مسلمان نام رکھتا کہ اس وقت نہ تو مسلمان ناموں کی کوئی شناخت قائم ہوئی تھی، نہ اسلامی لباس کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ ہی مروجہ معنوں میں تبدیلیٔ مذہب کے عمل سے لوگ واقف تھے۔ محمد رسول اللہ کے حلقۂ قدسی صفات میں داخل ہو جانے کے بعد بھی بظاہر وہ شخص ویسا ہی دکھائی دیتا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ البتہ اس کے اندرون کی دنیا بدل چکی ہوتی۔ تب قلب ونگاہ کی اسی تبدیلی کو ایمان کہتے تھے جس کی شہادت عمل کے ذریعے دی جاتی نہ کہ ظاہری تراش وخراش سے۔ نزول قرآن نے متبعین محمد کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہی لوگ جو کل تک عرب وعجم کی عصبیت میں مبتلا تھے جن کے یہاں اپنے قبیلے کی بالادستی کے لئے پشتہا پشت جنگوں کا سلسلہ چلتا اب وہی لوگ کو نوار ربانیین کی آفاقی دعوت کے علمبردار بن گئے تھے۔

ابتدائی عہد کے مسلمان اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ حامل قرآن کی حیثیت سے دین براہیمی کا مستند فہم تو ان کے ہاتھ ضرور آ گیا ہے البتہ انبیائے سابقین کے گروہوں میں متبع نفوس کے ایمان پر سوالیہ نشان لگانا ان کا کام نہیں۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ آنے والی تاریخ میں متبعین محمدؐ کے کلیدی رول کے باوجود دوسرے ایمانی طائفوں اور انبیائے سابقین کی باقیات کا رول کالعدم نہیں ہو گیا ہے بلکہ انہیں بھی اس نبوی تحریک میں اپنی اپنی بساط بھر شریک وسہیم ہونا ہے۔ مسلمان جب تک اس وسعت قلبی کے حامل رہے انہیں ربانی دعوت کے علمبردار کے طور پر دیکھا گیا۔ غیر اقوام کے لئے اسلام کی آفاقی دعوت میں غیر معمولی کشش رہی۔ البتہ جب عباسی بغداد میں عرب عصبیت کو سلطنت کی بنیاد کے طور پر پیش کیا جانے لگا اور ریاست میں کلیدی عہدوں کے لئے صلاحیت اور صالحیت کے بجائے قومِ مسلم سے تعلق کو وجہ تفوق قرار دیا جانے لگا تو نہ صرف یہ کہ ہماری نظری بنیادیں متاثر ہوئیں بلکہ ہم اس بلند نگہی اور وسعتِ قلبی سے بھی خالی ہوتے گئے۔ اقوامِ عالم کی قیادت کے بجائے ہماری نگاہیں مسلم قومی افتخار کے پروجیکٹ پر مرکوز ہو گئیں اور ہم اہل کتاب اور دیگر اہل ایمان طائفوں کو حلیف کے بجائے حریف سمجھنے لگے۔ فکر ونظر کی اس تبدیلی میں صلیبی جنگوں کا بھی کسی حد تک دخل تھا جس نے وقتی طور پر فقہاء کے اندازِ فکر کو متاثر کیا۔ افسوس کہ اہل

کتاب کی طرف بعض سیاسی عوامل کے تحت ہمارے رویے میں جو تبدیلی آئی تھی اسے آگے چل کر دوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور آفاقی نقطۂ نظر سے دست برداری کے سبب دفاعی جنگ لڑنا ہمارا مقدر بن گیا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ مختلف عہد میں سیاسی اور تاریخی عوامل کے تحت مسلم تصور حیات میں جو تبدیلیاں آتی رہی ہیں انہیں دائمی حیثیت عطا کرنے کے بجائے ان کا تنقیدی محاکمہ کیا جائے تب ہی اس قرآنی تصورِ حیات کی از سرِ نو تشکیل ممکن ہے جس کے بغیر ہم اقوام عالم کی قیادت کے متحمل نہیں ہوسکتے۔

بحث کو سمیٹتے ہوئے مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے:

۱۔ متبعین محمدؐ کی اصل الاصل شناخت صبغۃ اللہ سے عبارت ہے۔اسلام تمام عالم انسانیت کو کونوا ربانیین کی دعوت دیتا ہے۔محمدؐ رسول اللہ جو دینِ براہیمی کے سچے امین ہیں، کسی نئی امت کے قیام کے لئے نہیں آئے بلکہ آپؐ کا کام اسی دین براہیمی کا احیاء اور امت مسلمہ کی تشکیل نو ہے جو قرآن مجید کی تعریف کے مطابق، تمام انبیاء صادقین اور ان کے سچے متبعین کو محیط ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں ولا و براء کا تصور متبعین اور منکرین کے مابین پائے جانے والے قطبین جیسے فرق کو واضح کرتا ہے۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ متبعین محمدؐ دوسری قوموں کی طرح خود کو ایک قوم قرار دے ڈالیں۔نظریے کی بنیاد پر اٹھائی جانے والی امت کسی قومی یا گروہی تشخص کی متحمل نہیں ہوسکتی اور نہ ہی امت محمدیہ کے خول میں پناہ لینا اس کے اصل الاصل مزاج کا صحیح عکاس ہوسکتا ہے۔

۳۔ اہل کتاب کے سلسلے میں قرآن مجید کی بظاہر متعارض آیتیں ہمارے مفسرین کے لئے خاصی الجھن کا باعث رہی ہیں۔ان تمام آیات کو مجموعی فضا میں سمجھنے کے بجائے بالعموم شانِ نزول کی روایتوں کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کے بجائے خود قرآن مجید کی عمومی فضا میں ان آیتوں کا مطالعہ کیا جائے۔ہمارے خیال میں یہ تمام آیتیں متبعین محمدؐ کی قیادت میں انبیائے سابقین کے مجوزہ رول کا پتہ دیتی ہیں۔آخری رسولؐ کی بعثت کے بعد قیادت پر تو یقیناً ان کے متبعین ہی فائز رہیں گے۔ایسا اس لئے کہ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے دوسروں کے مقابلے میں وہ اس بات کے کہیں زیادہ سزاوار ہیں۔چنانچہ انبیائی تحریک کی سمت کے تعین میں انہیں اپنے جیسے راہ یابوں پر ہی انحصار کرنا ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿لا تتخذوا الأولياء من دون المؤمنين﴾۔رہی یہ بات کہ مسلمان بحیثیت قوم مجموعی طور پر انبیائے سابقین کے طائفوں کے سلسلے میں کسی سوءِ ظن کا شکار نہ ہو جائیں تو انہیں اس خیال سے باز رہنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ليسوا سواء من اهل الكتاب امة قائمة يتلون آيات الله آناء الليل وهم

یسجدون ﴾۔ سیادتِ عالم کے منصب پر فائز قوموں کو یہ اندازہ تو ضرور ہونا چاہئے کہ اہل ایمان کے طائفوں میں سے کون ان کے لئے کتنا حامی و مددگار ہوسکتا ہے: جیسا کہ ارشاد ہے کہ ''اور ایمان والوں سے سب سے زیادہ دوستی کے قریب آپ یقیناً انہیں پائیں گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں''۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اہل یہود سے کسی خیر کی توقع نہ رکھی جائے کہ ﴿فی قوم موسیٰ امة یهدون بالحق ﴾۔ انبیائے سابقین کے تمام گروہ ہماری اولین توجہ کے مستحق ہیں بلکہ سچ کہئے تو ہمارے پروگرام کا حصہ ہیں کہ ہمیں کلمۃ سواء کی بنیاد پر ان کے ساتھ اشتراک عمل کا پروگرام تشکیل دینا ہے۔ البتہ ہماری بلند نگاہی اور وسعت قلبی سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم انبیائے سابقین کی باقیات کو یا ان کی طرف سے پیش کئے جانے والے عملی منصوبے کو بغیر کسی تنقید و تجزیے کے قبول کرلیں گے۔ خود کو انبیائے سابقین کی باقیات باور کرانے والے اگر کھلے عام کفر کا ارتکاب کرنے لگیں تو پھر اشتراکِ عمل کی بنیاد ختم ہوجاتی ہے۔ کلمۂ سواء کی بنیاد پر تشکیل پانے والے پروگرام میں متبعینِ محمدؐ کو نظری، فکری اور عملی ہر طرح کی قیادت فراہم کرنی ہے کہ قرآن مجید کی موجودگی میں دوسرے وثیقہ ہائے ہدایت کو فیصلہ کن اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ اور نہ ہی رواداری کا یہ مطلب ہے کہ مسلمان وحی ربانی کے سلسلے میں کسی مداہنت کا شکار ہوں کہ رواداری اگر کسی مصلحت پسندی کے نتیجے میں ہو تو یہ ہمارے قافلے کو بے سمت کرسکتی ہے: ﴿ولن ترضیٰ عنك الیهود والنصاریٰ حتی تتبع ملتهم﴾۔

۴۔ انبیائے سابقین کے باقیات ہوں یا موجودہ قومی مسلمان' اللہ کے نزدیک انہیں ایک دوسرے سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ ان کا ایمان اور عمل صالح ہے۔ وہ لوگ جو کافر قرار دئے جاتے ہیں وہ پیدائشی طور پر ایسے نہیں ہوتے۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کے ان کافروں کا تذکرہ ہے جن کی راہ یابی بیّنات کے نزول اور رسول کی بعثت کے بغیر ممکن نہیں ﴿لم یکن الذین کفروا من اهل الکتاب ﴾ یہود جنہیں تمام اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی گئی جب کفر و معصیت میں مبتلا ہوئے تو نہ صرف یہ کہ انہیں قیادت سے معزولی کا عذاب چکھنا پڑا بلکہ ان کی خلّاقانہ صلاحیتیں ماند پڑ گئیں۔ ایک طرح کی بندر صفتی ان کا قومی شعار بن گئی۔ خلاقانہ قوتوں کا آبشار خشک ہوگیا۔

ایمان سے کفر کا یہ سفر کھلے امکانات کا ایک ایسا دروازہ ہے جس میں افراد اور قومیں ہمہ وقت داخل ہوسکتے ہیں۔ دنیا میں جب بھی ایمانی معاشرے کا بگل بجایا جائے گا اس کے مخاطب نہ تو اہل یہود ہوں گے نہ عیسائی اور نہ ہی موجودہ دور کے قومی مسلمان بلکہ تمام عالم انسانیت اس آواز کی یکساں مخاطب ہوگی۔ پھر جو کوئی بھی خدا کی آواز پر لبیک کہتا ہوا آگے آئے گا وہ اس دور کے طائفۂ اہل ایمان کا مستند حصہ قرار پائے گا۔ خواہ اس کا تعلق ملی، جغرافیائی، نسلی یا دینی عتبار سے کسی بھی گروہ سے رہا ہو۔ ماضی میں محمدؐ رسول اللہ کے گرد قدسی نفوس کی جو کہکشاں سجی تھی اس میں حبشہ کے بلال، فارس کے سلمان، روم کے

صہیب، مکہ کے مہاجرین اور یثرب کے انصار اپنی تمام سابقہ شناخت کو خیر باد کہتے ہوئے ربانیوں کے قافلے میں شامل ہو گئے تھے۔ فکر و نظر کے اس ہمہ گیر انقلاب نے یثرب کی چھوٹی سی بستی کو المدینۃ المنورۃ یعنی City of Enlightenment میں تبدیل کر دیا تھا۔ آج بھی اگر متبعین محمد اپنی اس نظری شناخت کی دوبارہ بازیافت کر سکیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود کو ایک نئے Enlightenment کے جلو میں نہ پائیں۔